مقالات

اسلامی قانون اور نظام معاشرت

(۲)

ترجمہ مولوی ابو نصر محمد خالدی صاحب

(ماخوذ از "لیگیسی آف اسلام")

قانون ایک معاشری حقیقت ہے جس کا ایک جزء جماعت سے متعلق ہے اور دوسرا فرد سے ہر وہ چیز جو خانگی امور سے متعلق نہ ہو اصطلاحاً حق اللہ کہلاتی ہے کیونکہ اسلامی تصور کے لحاظ سے خدا کو قدیم شہری مملکت کی جگہ دی گئی ہے۔ حقوق اللہ میں آزادی، غلامی، نکاح، قرابت، سود کی ممانعت اور تعزیری قوانین کے احکام شامل ہیں۔ ان احکام سے انحراف نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کا تعلق عام مفاد سے ہے یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انکا تعلق امن عامہ سے ہے اور وہ انفرادی مرضی کے تابع نہیں ہیں۔ تعلقات کا دوسرا حصہ افراد کے خانگی حالات سے متعلق ہے جو حقوق العباد کہلاتے ہیں۔

آزادی کو قانون کی اصل بنیاد تصور کرکے اسلامی مقنن دو نتیجوں پر پہنچتے ہیں:۔

(۱) آزادی کی فطرت ہی میں پابندی موجود ہے کیونکہ غیر محدود آزادی خود بربادی کی طرف لیجاتی ہے اور اس پر حد یا بندش عائد کرنا ہی قانون ہے۔

(۲) کوئی بندش بے وجہ نہیں ہوتی کیونکہ اسکا تعین افادے کی بنا پر ہوتا ہے۔ یعنی فرد یا

جماعت کی زیادہ سے زیادہ بھلائی پر۔ قانون کی بنیاد یعنی افادہ خود اپنی حد مقرر کرتا اور اپنے لیے وسعت پیدا کر لیتا ہے۔

یہاں قانون اسلامی کے دو شعبوں پر سرسری تبصرہ کرنا ان اصولوں کی عملی حیثیت اچھی طرح ذہن نشین کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔ زمین پر خدا کا نائب ہونے کی حیثیت سے انسان کو مستقل حیثیت دی گئی ہے۔ انسان میں اپنے حقوق و فرائض معلوم کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ہر شخص بحیثیت ایک "وو شخص" کے اپنی آزادی اور تحفظ خودی کے حق کا شعور رکھتا ہے۔ آزادی ہر شخص کا غیر منفک حق ہے اور غلامی اس کلیہ کا مستثنیٰ ۔ "آدم اور حوا آزاد تھے"، یہ ایک مفروضہ ہے جس سے قانون سازوں نے متعدد نتیجے نکالے ہیں۔

(الف) وہ لاوارث بچہ جس کا مرتبہ نامعلوم ہے آزاد تصور کیا جائے۔

(ب) اگر کسی آزاد آدمی کے متعلق غلام ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو اسکو اس وقت تک اپنی آزادی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں جب تک کہ قانونی طور پر اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے۔

(ج) شک کی صورت میں اس کے آزاد ہونے ہی کا ظن غالب ہوگا۔

آزادی کے معنی اختیار تمیزی کی قوت کے ہیں۔ آزاد آدمی کا سوائے خدا کے کوئی مالک نہیں ہوتا، جو تمام نوع انسان کا حاکم اعلیٰ ہے اور ہر قسم کی اطاعت اسی کے لیے مخصوص ہے۔ لہٰذا آزادی حسب مرضی فروخت نہیں کی جاسکتی حتی کہ خود اختیاری غلامی کو بھی قانون جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اسی قاعدہ کے تحت قانون خودکشی کی ممانعت کرتا ہے اور مذہب اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ یہی اصول اور یہی طریقہ حقوق ملکیت کے اصول پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ از روئے امکان ہر شخص کسی چیز کا بھی مالک ہو سکتا ہے کیونکہ کائنات کی ساری چیزیں انسان ہی کے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ملکیت قائم کر کے اللہ نے اس حق کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔ اس طرح اللہ نے ہر انسان کو اس قابل بنا دیا ہے

کہ وہ دولت کے عام ذخیرے سے اپنے مقسومہ حصہ کو معلوم کر لے اور معاشری نظم و ترتیب باقی رکھے۔
لیکن یہ فرض کرنا کہ ملکیت بحیثیت حق غیر محدود ہے صحیح نہ ہوگا۔ جس مقصد کے لیے اس حق سے مدد لی جاتی
ہے اسکی فطرت اور خود اس حق کی فطرت ہی میں اس کی حدود موجود ہیں۔ دنیاوی چیزیں انسان کو اس
لیے عطا کی گئی ہیں کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھے۔ مطلب یہ کہ ان کو مفید طریقے سے کام میں لائے، نہ یہ کہ
ان کو بلا کسی مقصد کے یا محض اپنی ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرے۔ کتاب وسنت کے
احکام کی متابعت میں اسلامی قانون، رومن لا کے اس اصول کو رد کر دیتا ہے کہ ہر شخص اپنی چیز کو ہر طرح
استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر وہ خرچ جو حقیقی فائدے کے لیے نہ ہو، مال اور
قوت کا ضیاع ہے۔ ہر بیجا خرچ ایک گناہ ہے۔ فضول خرچی ایک اخلاقی بیماری ہے جس کو بعض صورتوں
میں قانوناً رد کیا گیا ہے، اور جہاں قانون کی دست رس نہیں ہے وہاں دینی اعتقاد کی طاقت سے
اس مرض کو دفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام، اعتدال یعنی مال و دولت کے خرچ کرنے میں درمیانی
رستہ اختیار کرنے پر اصرار کرتا ہے اور یہی چیز قانون فطرت اور خدا کے اس مقصد کے عین مطابق ہے
جس کے لیے اس نے نوع انسان کو کائنات کی دولت دے کر سرفراز کیا ہے۔

معاہدات کے اصول میں بھی ہمکو اسی قسم کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ہر انسان معاہدہ کرنے اور
واجبات عائد کرنے کے قابل ہے اس لیے کہ اپنے وجود ہی کی بناء پر اس کو قانونی حیثیت عطا کی جاتی
ہے۔ لیکن اس مجرد اختیار کی بھی حدود ہیں جو معاہدہ کی نوعیت اور اس کی غرض کے لحاظ سے مقرر
ہوتی ہیں۔ نابالغ بچے اور مجنون اور بیمار اور دیوالیہ شخص کے معاہدات کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی
ہیں ان سے قانون کی اسپرٹ کا پتہ چلتا ہے اور یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی ذات یا اپنی جائداد
کے متعلق کوئی معاہدہ کرنے کا جو حق افراد کو دیا گیا ہے وہ کن شرائط اور کن قیود کے ساتھ مشروط اور مقید
ہے۔ ان تمام قیود و شرائط کی بنیاد قانون کے اس منشاء پر ہے کہ غیر موزوں شخص کی جائداد کو خود اس کی

نا اہلی کے نتائج سے محفوظ رکھا جائے ۔ اصولاً ہر شخص اپنے حق کو استعمال کرنے کا مجاز ہے بلا لحاظ اس بات کے کہ ایسا کرنے میں دوسروں کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے کیونکہ ہر حق کا مقصد لازماً حق دار کو اپنے حق کا فائدہ پہنچانا ہے لیکن اپنے حق سے فائدہ اٹھانے کے اس اختیار کی بھی ایک حد ہے جس کو دو قاعدوں میں بیان کیا گیا ہے ۔

الف ۔ کوئی شخص اپنے حق کو اس طرح استعمال کرنے کا مجاز نہیں ہے جس سے صرف دوسروں کا نقصان بلا لحاظ اپنے فائدے کے متصور ہو ۔

ب ۔ اور نہ کوئی اپنے حق کو اس طرح استعمال کرنے کا مجاز ہے جس سے دوسروں کو استعمال کنندہ کے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے ۔

یہ اصول اس نظام کے ہر حصے پر منطبق ہوتا ہے ۔ اس طرح والدین کو اپنی لڑکیوں پر جو اقتدار حاصل ہے یا مالکوں اور شوہروں کو اپنے غلاموں اور بیویوں پر جو اختیارات ہیں یا تعلقات ہمسائیگی کے جو اصول ہیں ان سب پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں ۔ ان تمام حالات میں منطقی عمل ہمیشہ یکساں رہتا ہے جب ایک مرتبہ اصول مقرر کر لیا گیا تو پھر مقنن کو اس کی حدود متعین کرنے میں محتاط رہنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر قانون نوع انسانی کو مدد دینے کے عوض اس کا دشمن ہو جائے گا ۔

اصول کا یہ نظام جو مسلمانوں کی زندگی کی انتہائی معمولی تفصیلات سے لے کر ان کے اخلاقی و معاشری وجود تک کے احکام پر مشتمل ہے سیدھا راستہ یعنی شریعت کہلاتا ہے اور اس کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے ۔

اس طرح علم الفقہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو دینیات کا ایک غیر منفک شعبہ ہے ۔ ایک شخص رومی مقننین کے اس مقولہ کو اسلامی قانون پر زیادہ صحت کے ساتھ چسپاں کر سکتا ہے جو وہ اپنے فن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ "وہ قانون انسانی اور خدائی چیزوں کا علم ہے"

امیر امت ایک حاکم اعلیٰ کا موجود ہونا قانون کے لیے ناگزیر ہے ۔ وہ ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ خود

قانون۔ قانون ایک معاشرتی حقیقت ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اسکی بنیاد انسانی معاشرے اور اس کی معاشرتی فطرت پر ہے۔ مگر بد قسمتی سے انسان با وصف فطرتاً معاشرت پسند ہونے کے ایک اچھا متمدن حیوان نہیں ہے۔ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ "لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہیں"۔ اگر انسان کو اس کی حرص و زیادتی کی جبلت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً وہ زمین پر فساد پھیلائے گا۔ قانون انسان کی فطرت رذیلہ کے خلاف ایک دوامی کشمکش ہے۔ اگر قانون کا کوئی محافظ و حامی نہ ہو تو وہ ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ جائیگا۔

نوع انسان کے فائدے کے لیے جن وجوہ کی بنا پر سعی و کوشش کی حد مقرر کرنا یعنی قانون بنانا ضروری ہوتا ہے، ان ہی وجوہ کی بنا پر یہ بھی لازمی ہے کہ اس کی راہ نمائی کے لیے ایک حکمران ہو جو بہ وقت ضرورت اس کو اطاعت پر بھی مجبور کرے۔ اس لیے اللہ نے ایک خلیفہ کے تقرر اور اس کے احکام کے اتباع کا حکم دے کر اس قانونی عمارت کو مکمل کر دیا۔ اقتدار صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے کیونکہ کسی انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے اپنے ہم جنسوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ انسانوں میں اقتدار کی خواہ کوئی شکل ہو، باپ کا اقتدار اولاد پر، استاد کا شاگرد پر، آقا کا غلام پر، راعی کا رعیت پر، غرض ہر قسم کے اقتدار کی بنیاد سوائے خدا کی مرضی کے کسی اور چیز پر نہیں ہے۔ قوت صرف اللہ کے لیے ہے، اور اللہ دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے چند انسانوں کو اپنی قوت بہ اندازۂ مختلف عنایت کرتا ہے۔ "اللہ جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے"۔ خلیفہ کا قیام اور اس کے احکام کی اطاعت ایک امت کے لیے جتنی ضروری ہے اتنی ہی کسی دوسری قوم کے لیے بھی ہے کیونکہ اگر کہیں مضبوط قائم شدہ قوت نہ ہو تو پھر وہاں نہ کوئی انسانی معاشرہ ہوگا اور نہ مذہب؛ بلکہ وہ صرف ایک بے ترتیب یا گم کردہ راہ انبوہ ہوگا جہاں وہ تمام چیزیں جن کی وجہ سے کسی کو زندہ رہنے کی آرزو ہوتی ہے تباہ ہو جائینگی۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں میں دین کی انتہائی ضروریات بھی شامل

ہیں جنکا پورا ہونا نظم و ترتیب اور ہر فرد بشر کی سلامتی پر منحصر ہے۔

"خلیفہ مملکت کی عمارت کا اہم ترین ستون ہے" لہٰذا اس کا نصب و قیام ایک مذہبی فریضہ ہے۔ ہر مسلمان کو اس کی فکر ہونی چاہیے۔ ایسے فریضے سے گریز کرنا امت اسلامیہ سے غداری کرنا ہے۔

ان ہی اسباب کی بنا پر امت کی نیابت وقت واحد میں صرف ایک ہی مقتدر کے سپرد ہونی چاہیے[1]۔

(الف) کیونکہ وحدتِ شریعت وحدتِ اقتدار کی مستلزم ہے۔

(ب) کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ کے اگر ایک سے زائد حصہ دار ہوں تو نظم معاشرت محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کے الفاظ میں "اگر زمین آسمان میں اللہ کے سوا اور الٰہ بھی ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے"

اپنے عہدے کے فرائض ادا کرنے کے لیے اس مقتدر واحد میں چند اخلاقی و جسمانی صفات لازمی ہیں:۔

(۱) آزادی — غلام خلیفہ نہیں ہو سکتا کیونکہ جس شخص کو خود اپنے عمل کی آزادی حاصل نہ ہو وہ ایسی قوت حاصل نہیں کر سکتا جو ایک مقتدر کے لیے ضروری ہے۔

(۲) وہ جنس ذکور سے ہو کیونکہ حدیث کے الفاظ ہیں "جو قوم عورت کو اپنے اوپر حاکم بنائیگی وہ

---

[1] اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری اسلامی دنیا کی حکومت کا نظم و نسق براہِ راست ایک خلیفہ کے ہاتھ میں ہو۔ انتظامی اغراض کے لیے اگر مقامی حکومتیں اپنی اپنی جگہ خود مختار رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان سب کا قانون کتاب اللہ و سنت رسول اللہ پر مبنی ہو۔ البتہ اسلام کا مقصود اسطرح پورا ہو سکتا ہے کہ تمام مقامی حکومتیں ایک عالمگیر اسلامی وفاق کی جزبن کر رہیں، اس وفاقی نظام کے اجزاء میں سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور معاشی حیثیت سے پورا پورا تعاون ہو، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات میں اس پورے نظام کی ایک پالیسی ہو، اور وفاقی مرکز پر خلیفۂ اسلام بحیثیت صدر کے متمکن ہو جسے وفاقی اجزاء باہمی اتفاق سے یا معتدبہ اکثریت سے منتخب کریں۔ ترجمان القرآن

ہرگز فلاح نہیں پائیگی"۔

(۳) قانونی قابلیت یعنی عاقل و بالغ ہونا۔

(۴) ایسے جسمانی عیبوں سے پاک ہونا جو اس کے فرائض کی ادائی میں حارج ہوں۔

(۵) شریعت کا علم۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ شریعت کا علم کتنا ہونا چاہیے۔

(۶) عقل و ہمت تاکہ امن و جنگ کے زمانے میں وہ اپنی مفوضہ خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکے۔

(۷) اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کے مطابق اخلاقی زندگی۔

(۸) سب سے آخر لیکن اہمیت میں سب کے برابر یعنی مقتدر کا قریشی النسل ہونا[1] کیونکہ قریش ہی وہ قبیلہ ہے جس سے آنحضرت صلعم کا تعلق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب خاندانوں میں اس قبیلہ کا امتیاز قدیم زمانے سے تسلیم کیا جاتا تھا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے ایک اصول کی صورت اختیار کرلی۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ اس قبیلہ کی کسی خاص شاخ ہی کے سپرد کیا جائے۔ اس عجیب شرط کی اصل وجہ لازماً یہ تھی کہ خلیفہ کا خونی رشتہ عربی نسل سے رہے۔ یہ بات اصول کے خلاف ہے کہ خلافت کسی پردیسی سے بھی متعلق ہوسکتی ہے ترکوں کی خلافت کے ناجائز ہونے کا یہ بھی ایک سبب ہے۔

[1] فاضل مصنف نے یہاں بلا تحقیق ان لوگوں کا قول نقل کر دیا ہے جو خلافت و امامت کے لیے قرشیت کو شرط قرار دیتے ہیں قرآن کی کسی آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ خلیفہ کا قریش سے ہونا ضروری ہے اور یہ کہ غیر قریشی خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ جس شخص نے اسلام کی فطرت کو کچھ بھی سمجھا ہو وہ اس حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا کہ کسی منصب کو اہلیت کے بجائے نسل و نسب کے ساتھ مخصوص کرنا اس دین کی بنیاد ہی کے خلاف ہے۔ رہیں وہ احادیث جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "ائمہ قریش سے ہونگے" (یا اسکے ہم معنی دوسرے الفاظ) تو در اصل ان میں حکم اور قانون نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ جب تک قریش اس منصب کے اہل رہینگے خلفاء اور ائمہ انہی میں سے ہونگے۔ ترجمان القرآن

اس بیان کے بعد یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ امت اسلامیہ کے امیر کا انتخاب محض اتفاق یا جبر و قوت پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ وہ ان لوگوں کی پختہ غور و فکر پر منحصر ہے جو اس بات کے جانچنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں کہ آیا خلافت کا امیدوار منتخب ہونے کا مستحق ہے یا نہیں۔ اس طرح ظاہر ہے کہ منتخب کرنے والی جماعت تمام مسلمانوں پر مشتمل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ کام صرف وہ افراد انجام دے سکتے ہیں جو اپنی تہذیب، اپنے معاشری رتبے، دنیاوی معاملات کے متعلق اپنے تجربے اور اپنے اخلاق کی بناء پر حکم بننے کے لیے موزوں ہوں۔ رائے دینے والوں کا حلقہ اصحاب سیف و قلم یا دوسرے لفظوں میں کشوری و عسکری طبقے کے سربرآوردہ افراد تک وسیع ہے۔ عزل و نصب کا اختیار ان ہی کو دیا گیا ہے جس کا مطلب پوری امت کی جانب سے اُس عہد کا اقرار کرنا ہے جس پر خلیفہ کی فرمانروائی اور عام مسلمانوں کی اطاعت منحصر ہے۔ قانون میں انتخاب سے مطلب وہ فعل ہے جس سے عوام یا انکی طرف سے سربرآوردہ لوگ اپنے منتخب کردہ شخص کو اقتدار اعلیٰ سپرد کرتے ہیں۔ یہ ایک معاہدہ یا عقد کا پیش کش ہوتا ہے جس کو اگر وہ شخص جسکو یہ پیش کیا جاتا ہے قبول کرے تو معاہدہ منعقد ہو جاتا ہے۔

پہلی صدی ہجری میں قیام خلافت کے لیے ایک دوسرا طریقہ بذریعۂ رواج مقرر کیا گیا یعنی حکمراں خلیفہ کا اپنا جانشین یا وارث مقرر کرنا۔[۱] اس قسم کا تقرر عقد کے مساوی خیال کیا جاتا تھا اور اگر قبول کر لیا

---

[۱] اس سے اگر حضرت ابوبکرؓ کے اس فعل کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کے لیے وصیت فرمائی تھی، تو مصنف کی تعبیر غلط ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت نے مسلمانوں پر حضرت عمرؓ کی خلافت کو واجب نہیں کر دیا تھا، بلکہ مسلمانوں کو اسے رد کر دینے کا پورا اختیار تھا۔ پس درحقیقت حضرت عمرؓ کی خلافت حضرت ابوبکرؓ کی وصیت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ عامۂ مسلمین کے اس وصیت کو قبول کر لینے کا نتیجہ تھی۔ اور اگر مصنف کا اشارہ حضرت امیر معاویہؓ کے اس فعل کی طرف ہے کہ انہوں نے اپنے بعد اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کیا، تو سب کو معلوم ہے کہ یہ فعل اسلامی قانون میں کبھی جائز نہیں تسلیم کیا گیا، اور نہ اس نوع کا رواج کبھی اسلامی قانون کا جزو بن سکتا ہے۔ یزید اور بعد کے بادشاہوں کے دعوائے خلافت کو علمائے اسلام نے صرف اس بنا

(بقیہ حاشیہ صـ ۴۲۲ پر دیکھیے)

جاتا تو واقعی عقد ہو جاتا تھا۔

جس طریقے سے عقد کی تکمیل ہوتی ہے وہ بیعت کہلاتا ہے۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب دو شخصوں کے درمیان کسی چیز کی خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو جاتا تھا تو وہ قطعی اقرار کی علامت کے طور پر ہاتھ ملاتے تھے اور اس ہاتھ ملانے کو لفظ "بیعت" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اسلام میں اسی لفظ کو اتباع و اطاعت کے اقرار کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ خلافت کے لیے جب کوئی شخص منتخب کیا جاتا تو لوگ اسکی اطاعت کا اقرار کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اسی چیز کا نام "بیعت" ہے۔ اب ہم بیعت کے اثرات پر دو حیثیتوں سے غور کرینگے (۱) خود خلیفہ سے متعلق (۲) اس کے زیر حکومت رہنے والوں سے متعلق۔

خلافت قبول کرنے کے بعد خلیفہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند کرتا تھا کہ وہ اپنے اختیارات صرف شریعت کے حدود میں استعمال کریگا۔ اس کے فرائض میں یہی چیز سب سے پہلی اور سب سے زیادہ ضروری تھی کیونکہ انسان کا خاتمہ صرف اسی دنیا کی اغراض پر نہیں ہو جاتا جو فی نفسہٖ تہی مایہ اور حقیر ہونے کے علاوہ موت یا فتنہ و فساد سے ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ مقصود اصلی دین ہے جو انسان کو دوامی راحت کی زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

خلیفہ اسلام کی دنیاوی اغراض کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے جیسے سرحدوں کی حفاظت، کفار کے خلاف جہاد کی راہ نمائی، اندرونی امن و امان، دولت عامہ کا انتظام اور قیام عدل۔

اس دوگونہ فرض کے انجام دینے میں امت اسلامیہ کا سردار خلیفۂ رسول اللہ کی حیثیت سے موثر خدمت انجام دیتا ہے۔ رسول اللہ کے جانشین آپ کی نبوت کے وارث نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۱) پر تسلیم کیا کہ کوئی طاقت اس جبری استیلاء کو الٹ پھینکنے کے لیے موجود نہ تھی اور احادیث میں یہ ہدایت فرما دی گئی تھی کہ ایسے حالات میں قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرو تاوقتیکہ تم کو صریح معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ ترجمان القرآن

اور جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں، ان کی حیثیت ایسے قائم مقاموں سے زیادہ نہیں ہے جو امت کی مذہبی اور دنیاوی بھلائی کے لیے آپ کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔

ابوبکرؓ نے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور صرف خلیفۂ رسول اللہ کہلانے پر قناعت کی۔ بعد میں عمرؓ کے زمانے سے امیرالمومنین کا استعمال شروع ہوا جو اقتدار اعلیٰ کے نمایندے کی حیثیت کو بہترین طور پر ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ملک کا مالک نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے اصلی مفہوم کی رو سے مساوی درجہ کے لوگوں میں برتری رکھنے والا ہے۔

لفظ امام، جسکے معنی نماز کی پیشوائی کے ہیں، ہر زمانے میں اقتدار اعلیٰ کے انتہائی حق کو ظاہر کرتا رہا ہے، یعنی اسکا مذہبی منصب ہی دوسرے تمام فرائض کا مصدر ہے اور اس منصب میں اسلامی قانون کے مطابق انصاف رسانی، جہاد اور احتساب شامل ہے۔ علمائے اسلام جب کبھی مجرد لفظ "امام" بلا کسی تفصیل و تشریح کے استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کا مطلب مملکت کا حاکم یعنی قوت کا آخری مصدر ہوتا ہے اور تمام اجتماعی معاملات اسی کے نام سے انجام پاتے ہیں۔ لیکن ان کاموں کے انجام دینے میں خلیفہ کی حیثیت پروہت یا اسقف کی سی نہیں ہوتی اور نہ اس میں تقدس کی شان پیدا ہوتی ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ خلیفہ بحیثیت مذہبی صدر کے پوپ نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کی پوپانہ حیثیت نہیں پائی جاتی کیونکہ اسلام میں حواریوں کا کوئی سلسلہ نہیں۔ نہ تو وہ نسلی پروہتوں کا کوئی ادارہ ہے، اور نہ خلیفہ سیاسی حیثیت ہی سے ایسا ہے۔ خلافت کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جس کو مفاد عامہ کے لیے خدا نے براہِ راست مامور و مقرر کیا ہو بلکہ وہ خدائی قانون کو نافذ کرنے اور جماعتی مفاد کی خدمت کرنے کے لیے خود امت کا منتخب کردہ ایک عہدیدار ہے جسے "امین امت" کہنا چاہیے یعنی امت اس پر اعتماد کر کے اپنی امانت اسکے سپرد کرتی ہے۔ خلیفہ کو اکثر گلہ بان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اسکی ذات وہ مرکز ہوتی ہے جس سے وابستہ ہو کر گلّہ کے افراد مجتمع رہتے ہیں۔ جس طرح ایک گڈریہ اپنے

گلہ کی نگہبانی کرتا ہے یا جس طرح ایک استاد اپنے شاگردوں کی نگرانی کرتا ہے اسیطرح خلیفہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مقرر کیا جاتا ہے کیونکہ مسلمان کسی امام کے بغیر نہ مجتمع ہو سکتے ہیں نہ اپنی آپ حفاظت کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ خلیفہ جماعت مسلمین کا وکیل ہے ـــ اسکے کارنامے کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ امت کی بھلائی کے لیے کیا کام کرتا ہے، کیونکہ اس کو حاکم ہی اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے، اس مقصد سے قطع نظر کرنے کے بعد اس کے مسند حکمرانی پر بیٹھنے کے لیے کوئی سند جواز نہیں ہے۔ وکیل اس بات کا پابند ہے کہ مالک کو اپنے اعمال کا صحیح صحیح جائزہ دیا کرے۔ اسیطرح خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ خدا کے روبرو اپنا حساب پیش کرے۔ ابو یوسفؒ خلیفہ ہارون الرشید کو لکھتے ہیں کہ "میں آپ کو اس گلّے کی نگہبانی کرنے کی نصیحت کرتا ہوں جو آپ کی امانت میں دیا گیا ہے...... کیونکہ گلّہ بان ہی اپنے ریوڑ کا ذمہ دار ہے اسیطرح خدا کے یہاں آپ سے اپنی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی۔" جماعت اور امام ان دو سیدھے سادے لفظوں میں اسلام کا سارا سیاسی نظام اور اسکے ساتھ مملکت کے اسلامی تصور کا خلاصہ موجود ہے۔

مملکت کے اختیارات نمائندگی اور اختیارات عاملہ دونوں خلیفہ کی ذات میں مرکوز ہیں۔ اگر قانون صریح اور واضح ہو تو خلیفہ کا فرض محض اس کو نافذ کر دینا ہے۔ اس صورت میں اسکو قانون میں ذرا سا تغیر و تبدل کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اس پر لازم ہے کہ بغیر کسی کمی و بیشی کے قانون کو صورت حال پر منطبق کرے۔ البتہ جن معاملات میں کوئی ایجابی قانون موجود نہ ہو وہاں خلیفہ کی آزادی عملاً غیر محدود ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایک معمولی کارندہ نہیں ہے بلکہ اسکی حیثیت وکیل کی ہے اور قانون کا نفاذ کرنا اس کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ علاوہ اس قانونی صواب دید کے خلیفہ کو بہت سے دوسرے عمومی معاملات میں بھی اپنی صواب دید کو استعمال کرنے کا حق ہے جیسے جہاد کی راہ نمائی، غنیمت کی تقسیم، مال گذاری کا تعین، مالیات عامہ کا مصرف، عمال کا تقرر۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان پر بیعت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والا امیر کی اطاعت و

اتباع کا معاہدہ کرتا ہے۔ "جس نے حاکم کی نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔" "اگر کوئی حبشی بھی تم پر حاکم بنا دیا جائے تو اسکی اطاعت کرو۔" امداد و نصرت کا فریضہ اطاعت کے فرض سے وابستہ ہے۔ بیعت کرنے والے پر لازم ہو جاتا ہے کہ امیر کی آواز پر لبیک کہے جبکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے امن وامان کو دھمکی دینے والے کسی دشمن کے مقابلہ میں مدد کے لیے پکارے۔ اس فرض سے صرف اس حالت میں آدمی مستثنیٰ ہو سکتا ہے کہ بیعت کرنے والے کے لیے مادی یا اخلاقی امداد کرنا بالکل ناممکن ہو۔ اسی طرح بیعت کرنے والے پر امام کے احکام کی اطاعت فرض ہے، الا یہ کہ امام کا کوئی حکم انسانی طاقت سے بالاتر ہو یا وہ شریعت کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً اگر خلیفہ کسی کو قتل کا، یا زنا کا، یا شراب پینے کا یا کسی ترک فرض کا حکم دے تو ایسی صورت میں خلیفہ کا حکم ماننا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ "گناہ میں اطاعت نہیں۔"

جب تک خلیفہ امت اسلامیہ کی حفاظت کے فریضہ کو انجام دینے کے قابل ہے اس وقت تک اسکا اور امت کا باہمی معاہدہ ناقابل انفساخ متصور ہوگا۔ البتہ جب خلیفہ امت کے وہ کام انجام دینے کے ناقابل ہو جنکی ازروئے حق انکو اس سے توقع تھی تو اس صورت میں خلیفہ کی امامت معطل اور بیعت قانوناً منسوخ سمجھی جائیگی۔ یہ تبدیلی جسمانی اہلیت یا آزادی کے ضائع ہو جانے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے مثلاً کافروں کے ہاتھ میں خلیفہ کی گرفتاری۔

خلافت کے اس خاکے پر راسخ العقیدہ مقننوں کے دبستان کا سیاسی نظام العمل حاوی ہے جسکو خلافت رسول اللہ کی اصطلاح سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ایسا اقتدار صرف ابتدائی چار خلفاء کی حکومت تک رہا جنھیں خلفاء راشدین بھی کہتے ہیں اور یہی اسلام کا زریں عہد تھا۔ اس کے بعد فقہاء مسلسل تنزل کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جس رفتار سے اسلام اپنے مصدر اصلی سے دور ہوتا گیا اسکا تنزل بھی بڑھتا گیا۔ حقیقی خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی، تلوار

کی حکومت یعنی خالص قوت اپنی سادہ حالت پر عود کر آئی جس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایک مختلف اللفظ حدیث بیان کی جاتی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "میرے بعد خلفاء ہوں گے ان کے بعد بادشاہ اور ان کے بعد ظالم"۔ اس قسم کی حدیثیں سنی نقطۂ نظر سے خلافت کی تاریخ کا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ اور فی الجملہ تاریخ اسکی تصدیق کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کے اس پر شوق تصور کے مطابق خلافت کبھی واقعتاً وجود ہی میں نہیں آئی۔[1] البتہ دور خلافت کے آغاز میں ابتدائی دو خلفاء کے تحت اس نے اپنا تصوری مطمح نظر قریب قریب حاصل کر لیا تھا، اور اگر حالات اس کے موافق ہوتے تو ایک نہایت ہی عمدہ طرز حکومت کے عناصر نشو و نما پا سکتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی پہلی نسل کا مشکل ہی سے خاتمہ ہوا تھا کہ ایک عظیم الشان انتظام سلطنت کی عملی ضروریات[2] اور عربوں کی سرکش طبیعت نے خلافت کو پہلے تو امویوں کے تحت شخصی حکومت

---

[1] یہ مصنف کا اپنا گمان ہے، ورنہ خود فقہاء اسلام، جن کے "پر شوق تصور" کا مصنف حوالہ دے رہا ہے، اس امر پر متفق ہیں کہ خلیفہ اول و دوم کے عہد میں اسلامی خلافت اپنے پورے تصوری مطمح نظر (آئیڈیل) کے مطابق تھی۔ ترجمان القرآن۔

[2] انتظام سلطنت کی عملی ضروریات نے نہیں بلکہ لوگوں کی نااہلی نے اس نظام کو ختم کیا۔ جو شخص جمہوریت کی حقیقت کو جانتا ہے وہ اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ایک جمہوری نظام حکومت کا قیام و بقا تمام تر مملکت کے اجزائے ترکیبی کی اہلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ جب مملکت کے باشندوں کی عظیم اکثریت ناتربیت یافتہ ہو اور ان میں اپنے حقوق و فرائض کا پورا شعور اور جمہوری دستور کی حفاظت کا طاقت ور ارادہ موجود نہ ہو تو وہ دستور کو ضائع کر دیتے ہیں، اور ایسی حالت میں کوئی جمہوری نظام نہیں چل سکتا۔ بالخصوص جس کے ساتھ وہ جمہوریت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی، اس کا چلنا تو دستوری شعور سے بڑھ کر تقویٰ اور عدل اور امانت کی بہترین صفات پر موقوف تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مملکت اسلامیہ میش تر ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۷ پر ملاحظہ ہو)

میں تبدیل کردیا اور اسکے بعد عباسیوں کے دور میں تو وہ ایرانی بادشاہت کی ایک نقل ہوکر رہ گئی جس کی ابتدائی نمائشی صورت کچھ مدت تک تو استبداد، ظلم و جور اور نظم و نسق کی بدانتظامی کو چھپائے رہی مگر بالآخر یہ بات کھل گئی کہ یہی اوصاف اس سلطنت کو تباہی کی طرف کھینچ رہے تھے۔

تیسری صدی ہجری میں بادشاہت نے بالکلیہ خلافت کی جگہ لے لی اور اس کے بعد خلافت کا عہدہ محض ایک نمائشی چیز بن کر رہ گیا۔ مرکزی سلطنت کی تباہی کے بعد جو فوجی سردار مختلف علاقوں پر قابض ہوئے، انہوں نے خلافت کے اقتدار اعلیٰ کو بطور خود استعمال کرنا شروع کردیا، اور بغداد کے خلفاء کی حیثیت صرف اتنی رہ گئی کہ جو سردار اپنی طاقت سے کسی علاقہ پر فرمانروا ہو جائے اسے رسمی طور پر فرمانروائی کا پروانہ دیدیں۔

فقہاء کو اس ناگزیر صورت حال سے دوچار ہونا پڑا اور انھوں نے اس تلخ حقیقت حال کو، جس طرح بھی وہ نباہ سکتے تھے نباہنے کی کوشش کی۔ اب مدرسوں میں یہ سکھایا جانے لگا کہ قائم شدہ حکومت اگرچہ شریعت کی ضروریات کے مطابق نہ ہو اور خواہ اسکی بنیاد خالص جبر و قوت ہی پر کیوں نہ ہو قابل اطاعت ہے کیونکہ وہ لامرکزیت سے محفوظ ہے۔ اب فقہا نے محسوس کیا کہ قدیم لائحہ عمل، عملی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے بہت زیادہ بلند تھا۔ متعدد علماء نے تسلیم کرلیا کہ امامت کے لیے ایسا بے داغ آدمی ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ شریعت ضروری سمجھتی ہے اور یہ کہ خلیفہ کا قریشی النسل ہونا بھی ناگزیر

بقیہ حاشیہ ص ۴۲۶ ـ لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انسانیت کاملہ کی تربیت پائی تھی اسلیے خلافت کا نظام بہترین صورت پر چلا۔ بعد میں جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور بکثرت ایسے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے جنہیں پوری اسلامی تربیت نہ ملی تھی، تو خلافت میں ضعف آنا شروع ہوگیا یہاں تک کہ جب نا تربیت یافتہ لوگوں کی عظیم الشان اکثریت، ایک قلیل التعداد تربیت یافتہ گروہ کے قابو سے باہر ہوگئی تو خلافت کے نظام کو اسکی اصلی صورت پر چلانا غیر ممکن ہوگیا، اور خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی۔ ترجمان القرآن

نہیں، حتیٰ کہ وقت واحد میں دو اماموں کا ہونا بھی ممکن خیال کر لیا گیا۔ ہر مسلمان کو اس شخص کی اطاعت کرنا چاہیے جو عالم واقعہ میں صاحب اقتدار ہو گیا ہو۔ ایک ظالم و فاسق بھی فرمانروا ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں مسلمان کے لیے بس یہ چارۂ کار ہے کہ "صبر کرو۔ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔ اور عدل قائم ہونے کا انتظار کرو۔"

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں امام غزالیؒ حسب عادت اپنی راست بازی کی بنا پر اس مسئلہ کو یوں پیش کرتے ہیں:۔

"ہم نے جو رعایتیں کی ہیں وہ خود روا نہ نہیں ہیں بلکہ ضرورت نے ممنوعہ چیزوں کو جائز قرار دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مردہ جانور کھانا ممنوع ہے لیکن بھوکے رہ کر مر جانا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب خلافت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ لینے والی کوئی چیز نہیں رہی ہے ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ مناسب اقتدار کی غیر موجودگی اور طوائف الملوکی کی وجہ سے معاشری زندگی کا تہ و بالا ہونا قابل ترجیح ہے یا موجودہ اقتدار کو، جیسا کچھ بھی وہ ہے، تسلیم کر لینا؟ فقیہ کے لیے ان دونوں میں سے موخرالذکر صورت اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں۔"

۶۵۶ھ ہجری مطابق ۱۲۵۸ء عیسوی میں مغلوں نے بغداد پر حملہ کیا، خلیفہ کو قتل کیا اور تمام عباسی خاندان کو تباہ کر ڈالا۔ خلافت، جو سیاسی قوت کے لحاظ سے ایک عرصہ پیشتر مردہ ہو چکی تھی، اب بالکل ہی ختم کر دی گئی۔ اس دور کے بعد تاریخ صرف سلاطین کا ذکر کرتی ہے۔ مصر میں ایک واقعی یا فرضی عباسی نے خلافت کے لقب کو باقی رکھا مگر یہ ڈھونگ صرف مملوک سلاطین کی سہولت کے لیے قائم رکھا گیا تھا۔ ۱۵۱۷ء عیسوی میں ترکوں نے قاہرہ پر قبضہ کیا تو اس وقت عباسی خاندان کی یہی آخری یادگار وہاں باقی رہ گئی تھی۔ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ آخری عباسی خلیفہ نے ترک حکمراں کو خلافت کا جو اقتدار منتقل کیا وہ بالکل جائز تھا۔ لیکن اگر یہ انتقال عمل میں آیا بھی ہوتا تو شرعی حیثیت سے وہ باطل و ناجائز تھا کیونکہ

خلافت حق ملکیت نہیں ہے کہ اسے حسب مرضی منتقل کیا جاسکے بلکہ وہ امت اسلامیہ کی امانت ہے اس لیے اگر سنہ ۱۲۵۸ء میں نہیں تو کم سے کم سنہ ۱۵۴۳ء میں خلافت کا واقعتاً خاتمہ ہو گیا۔ دمشق کے قاضی ابنِ جماعہ نے (تقریباً سنہ ۷۰۰ ہجری میں) اصل صورت حال اس طرح بیان کی ہے "حکمراں کو اس وقت تک حکومت کرنے کا حق ہے جب تک کہ دوسرا اس سے زیادہ قوی شخص اس کو اقتدار سے علحدہ کرکے اسکی جگہ خود حکمراں نہ ہو جائے۔ یہ نیا آنے والا شخص بھی اسی حق کی بنا پر حکومت کرے گا اور اس کو تسلیم کرنا بھی ان ہی اسباب کی بنا پر ہوگا۔ کیونکہ حکومت کے بالکلیہ نہ ہونے سے کسی نہ کسی حکومت کا ہونا بہتر ہے خواہ وہ قابلِ اعتراض ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کو چاہیے کہ دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی اختیار کریں"۔ مراکو کے فقہاء نے اس اصول کا خلاصہ ایک چھوٹے سے جملہ میں یوں کیا ہے کہ "ہر صاحبِ اقتدار کی اطاعت واجب ہے"۔ (باقی)

مسئلۂ قومیت

تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اصولِ قومیت کی تشریح و توضیح کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان نسلی یا وطنی قومیت کے اصول قبول نہیں کرسکتے نہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کوئی قومیت بنا سکتے ہیں۔

قیمت ۱۴ محصول ڈاک ۱؍

دفتر ترجمان القرآن - مبارک پارک - لاہور سے طلب کیجیے